محمد عاصم بٹ

دائرہ

(ناول)



دائرہ

(ناول)

محمد عاصم بٹ

سانجھ

نام کتاب	:	دائرہ
مصنف	:	محمد عاصم بٹ
سرورق	:	قمرالزماں
تزئین	:	رشید احمد قریشی
تعداد	:	500
اشاعت دوم	:	جون2008ء
قیمت	:	240
پرنٹر	:	حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور

ISBN: 978-969-8957-20-9

سانجھ
SANJH PUBLICATIONS

دوسری منزل، مفتی بلڈنگ، 17/31 ٹیمپل روڈ، لاہور
فون:042-7355323 فیکس:042-7323950
ای میل: sanjhpk@yahoo.com

دائرے کا کوئی آغاز، کوئی اختتام نہیں ہوتا۔ یہ لامختتم ہے اور اسی لیے دنیا کا سب سے بڑا بھید بھی۔

1

آسمان صاف تھا۔ستارے بچے کے ہاتھ سے چھوٹ کر چکنے فرش پر بکھرے روشن کنچوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ سامنے خوب پھیلے ہوئے درخت کی سب سے بلند شاخ پر ساتویں آٹھویں کے چاند کی پھانک ٹکی ہوئی تھی۔ یوں جیسے وہ انھی شاخوں میں سے طلوع ہوئی ہو۔

درخت کے پاس ہی تیز روشنیوں میں نہایا ہوا ایک مختصر سا منظر تھا۔ گھاس پر قنات جیسے بڑے بڑے پردے گول لپٹے ہوئے دھرے تھے۔ پلاسٹک کی سفید کرسی ایک پہلو پر گری ہوئی تھی۔ پاس ہی پیراشوٹ کے کپڑے کا کسی طرح کے سامان سے بھرا تھیلا بھی گھاس پر پڑا تھا جو تیز روشنی میں دودھیا معلوم ہو رہی تھی۔ چپس کے خالی تھیلے، جوس کے خالی پیکٹ، بجھے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے اور ڈبیاں، مڑے تڑے کاغذ اور ایسا ہی کچھ بے کار سامان ہر طرف بکھرا نظر آتا تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے یہاں لوگوں کا بہت رش رہ چکا ہو، جس کی باقیات بس یہی بے ترتیب سامان تھا۔ کچھ فاصلے پر البتہ کچھ گہما گہمی تھی۔

وہ پتھر کی بنچ پر بیٹھا دیر سے شاخ پر ٹکی چاند کی پھانک پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ وقفے وقفے سے اس کا جسم کپکپا کر رہ جاتا اور دانت بجتے۔ یخ بستہ ہوا کا جھونکا تیر کی طرح ہڈیوں کے گودے میں گھستا محسوس ہوتا۔ تب اس کے ذہن میں آگ کی قربت کی خواہش جاگتی یا اپنے بستر کی جس نے ایسی کتنی ہی راتوں میں اسے ایک پرحدت آغوش کی پناہ دی تھی۔

چاند پر مسلسل ٹکٹکی باندھنے سے اسے اپنی آنکھیں بھیگتی معلوم ہوئیں۔ اس نے انھیں جھپکا۔ آہستہ آہستہ اس کے ذہن کا انتشار، جو گزشتہ چند گھنٹوں میں پیش آمدہ واقعات کے باعث پیدا ہوا تھا، کافور ہو رہا تھا۔ بہت سے منظر ایک ہموار رفتار سے ذہن کے پردے پر نمودار ہوئے۔ اس نے

یاد کرنے کی کوشش کی؟ ذہن میں شبیہیں ابھر رہی تھیں، جو بے ربط تھیں۔۔۔

یہ اس کٹڑی کے میدان نما صحن کا منظر تھا جس کے بے شمار چھوٹے چھوٹے کمروں والے گھروں میں سے ایک میں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ صحن کے گرد پھیلے ان گھروں کی تین تین منزلیں تھیں۔ صحن کے بیچوں بیچ سرکاری نلکا لگا ہوا تھا جس میں بس صبح تڑکے ہی چند گھنٹوں کے لئے پانی آتا۔ تب آس پاس گھروں کے مکین بالٹیوں اور کنستروں سمیت اس پر ہلا بول دیتے۔ کبھی تو لائن بنا لیتے لیکن اکثر کسی عجلت کے مارے ہوئے کی لائن توڑنے کی کوشش کے نتیجے میں سبھی ایک بے مجمع کی صورت میں چھوٹے کھرے والے سرکاری نلکے کو گھیر لیتے اور اپنی اپنی باری کے بچاؤ کے لئے ایک دوسرے سے الجھ جاتے۔ خوب ہلا گلا رہتا۔

چند گھنٹوں کی اس مختصر کارروائی کے بعد تمام دن یہ نلکا بچوں کے تصرف میں رہتا۔ وہ اس کی ٹونٹی کو پورا کھول کر اس کے سانس لینے کی آوازیں سنتے۔ کبھی اس میں سے خراٹوں کی آواز آتی اور کبھی اچانک تیز خرخراہٹ کی۔ جس سے بچے ہڑبڑا کر دور بھاگتے اور پھر کچھ دیر سہمے رہنے کے بعد خوب قہقہے لگا کر ہنستے۔ پھر ایک اور منظر اسے دکھائی دیا۔ وہ گلے میں ٹاٹ جیسے کپڑے کا بھاری بستہ لٹکائے سکول جا رہا تھا یا شاید واپس آ رہا تھا۔ تب وہ چھٹی جماعت میں تھا اور سید مٹھا بازار میں عائشہ ماڈل سکول میں پڑھتا تھا۔ پھر ایک منظر سڑک پر پچکے ہوئے سر والے بچے کی لاش کا تھا۔ کوئی دو ایک برس پہلے اس نے ٹکسالی دروازے کے سامنے مین روڈ پر اسے دیکھا تھا۔ چودہ پندرہ برس کا بچہ تھا۔ ایک تیز رفتار ویگن نے اسے کچل دیا اور فرار ہو گئی تھی۔ ان تمام برسوں میں اس واقعے کا ایک منظر جو کبھی اس کے ذہن سے محو نہ ہو سکا تھا' وہ پچکے ہوئے بھیجے والے ساکت جسم کے ایک پیر کا ہولے ہولے کپکپانا تھا۔

ایک شبیہ عصمت کی تھی جو طیبہ ہائی سکول میں پڑھتی تھی۔ پھر اسے اپنا ایک دوست یاد آیا جس کے ساتھ اس نے پہلی مرتبہ شراب پی تھی۔ ایک منظر بازار کا بھی تھا جس میں گاہکوں کا خوب رش تھا۔ منظر تیزی سے بدل رہے تھے۔ بس سٹاپ، مال روڈ پر الفریڈ وولنر کا سیاہ دھاتی مجسمہ، نیاگرا آبشار کی ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر، ٹی وی پر پہاڑ سے لاوا پھوٹ بہنے کا منظر اور اس کا دفتر۔ اسے یاد تھا ابھی کچھ دیر پہلے، ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا، وہ اپنے دفتر کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ زمان خان تھا اور بھکاری بھی۔ منظر واضح ہو رہا تھا۔

گھڑی نے پانچ بار گھنٹہ بجایا تو اس کا آخری دفتری رفیق نیاز بیگ بھی کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا جو پچھلے قریب آدھ گھنٹے کے دوران صبح کے اخبارات کو تیسری یا چوتھی مرتبہ بغور پڑھ چکا تھا۔ اپنے ہمیشہ کے معمول کے مطابق وہ اب کھڑا خاموشی سے اپنی خالی کرسی کو تکتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا جیسے وہ کچھ بھول رہا ہو اور یاد نہ کر پا رہا ہو کہ وہ کیا بات تھی۔ دروازے کے برابر اسٹول پر بیٹھے زمان خان نے بآواز بلند جمائی لیتے ہوئے کہا ''بیگ صاحب۔ کیا سوچتی ہے؟''

نیاز بیگ اپنے خیالات سے چونکا۔ گردن پھیر کر زمان خان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے ویسے ہی متفکر انداز میں بولا ''سوچ رہیا ہاں خان صاحب۔ ایس ملک دا کیہ بنے گا میرے باجھوں۔''

''اتنا مت سوچا کرو بیگ صاحب۔ پہلے ہی اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔'' زمان خان نے قدرے بیزاری سے کہا۔

نیاز بیگ نے قہقہہ لگایا۔ ''ٹھیک آکھیا۔'' پھر اخبار کو تہہ کر کے بغل میں دبایا۔ عینک کو ناک کے بانسے پر اوپر سرکایا اور مڑا۔

وہ پستہ قد اور چوڑے جثے کا صحت مند مرد تھا اور ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر میں بھی جوانوں کی طرح اکڑ کر اور پیر اٹھا کر چلتا تھا۔ ایک عرصہ فوج میں گزارنے کے باعث اس کے مزاج اور معمولات میں ایک طرح کی بے لچک باقاعدگی اور میکانکیت سی در آئی تھی۔ وہ اپنے ہر معمول کو اصرار اور تکرار کے ساتھ دہراتا اور کبھی اس عمل سے تھکتا نہیں تھا۔ مخصوص وقت پر اخبار پڑھنا، مخصوص وقت پر سگریٹ سلگانا، مخصوص وقت پر دفتر کا کام کرنا اور اپنے ہی طے کیے ہوئے کسی مخصوص وقت پر ہمیشہ ٹانگیں پسار کر آرام کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ کوئی چار بجے کے قریب وہ روزانہ اپنی کرسی سے اٹھتا، سگریٹ سلگاتا اور لیٹرین کی طرف چل پڑتا۔ کاتب نوید احمد سگریٹ کا گہرا کش لے کر برابر بیٹھے پیسٹر امجد سے شرارتی انداز میں آنکھ دبا کر کہتا ''ٹی ٹائم'' اور مسکراتا۔ نیاز بیگ قبض کا شکار تھا اور آدھا گھنٹہ بیت الخلاء میں مصروف رہتا۔ دفتر کے سبھی دوستوں کی مشترکہ رائے تھی کہ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ ہمیشہ سے یعنی جب وہ فوج میں نہیں گیا تھا تب سے۔ فوج کی سخت تربیت بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکی تھی۔ لیکن خوش مزاج آدمی تھا۔ بس یہی ایک بات بھلی تھی اور وہ کبھی انہیں ناگوار محسوس نہیں ہوا۔

''استاد جی! چھڈ دیو کھیہڑا۔''

نیاز بیگ اس کی کرسی کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں مسکرائے۔ نیاز بیگ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ''اوور ٹیم، زندہ باد۔'' نیاز بیگ بہت تر و تازہ اور چاق و چوبند معلوم ہو رہا تھا۔ دونوں نے قہقہہ لگایا۔

زمان خان بیزاری سے اپنے داہنے نتھنے میں شہادت کی انگلی گھسیڑے صفائی کر رہا تھا۔ اس کے لئے ان صاحب لوگوں کا اوور ٹائم خوامخواہ کی دردسری تھی۔ اس نے شدید بے اعتنائی اور اکتاہٹ کے ساتھ اسے سر جھکائے کاغذ پر قلم گھسیٹتے دیکھا اور سوچا ''یہ بیٹھیں تو اوور ٹائم اور میں بیٹھوں تو ڈیوٹی۔ غریب آدمی کی کوئی عزت نہیں ہے یہاں زمان خان۔ جو شور مچاتا ہے وہی سچا ہے۔ آخر ہمارا بھی بال بچہ ہے، گھر بار ہے۔ ان کے لئے یہیں بیٹھے رہیں گے تو گھر پر ہمارا باپ کام کرے گا۔'' غصے میں زمان خان سٹول پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹ ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔ وہ دروازے سے نیاز بیگ کی میز اور میز سے واپس دروازے تک چکر لگانے لگا۔ اس نے سر اٹھا کر زمان خان کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ خان صاحب کا بلڈ پریشر نارمل حد سے تجاوز کر چکا تھا۔ پھر گویا ہمدردی جتانے کی خاطر قلم کاغذوں پر رکھتے ہوئے بولا ''کھانا وانا کھانے کا موڈ ہے۔ خان صاحب!''

زمان خان تھم گیا۔ بھوک تو اسے لگی تھی۔ قدرے رکھائی سے بولا ''کیا کھائے گی؟''

اس نے پتلون کی عقبی جیب سے بٹوا نکالا۔ سو سو کے تین نوٹ تھے، اتنے ہی دس دس کے اور ایک پچاس کا تھا۔ پچاس کا نوٹ باہر نکالا۔

''کچھ بھی لے آؤ۔ روغنی نان مت لانا جو تمہیں بہت پسند ہیں۔ کم از کم میرے لیے مت لانا۔ اپنے لیے بے شک لے آؤ۔ باقی جو کھانے کو مل جائے۔'' زمان خان نے آگے بڑھ کر نوٹ ہاتھ میں لیا اور کمر کی داہنی طرف قمیص کی جیب میں گھسیڑ لیا۔ وہ حسین چوک تک جانے کا سوچ رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کا سائیکل کا سفر ہے۔ لیکن کوئی مضائقہ نہیں۔ اچھا ہے ہاتھ پیر چلانے سے بھوک اور بھڑکے گی۔ بارہ مسالوں والے لذیذ چپلی کبابوں کا ذائقہ ابھی سے وہ اپنے حلق میں محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے داہنے نتھنے سے باہر جھانکتے چھوٹے سے گیلے بال کو دو انگلیوں کی چٹکی میں دبا کر کھینچا۔ سوئی چبھنے جیسی درد کی ٹیس ناک میں اٹھی۔ پھر چٹکی کو آنکھوں کے سامنے

کیا۔انگلیوں کی پوروں کے بیچ چھوٹا سا بال دبا ہوا تھا جس کے ایک سرے پر سیاہ نرم مواد چمٹا تھا۔چٹکی کھول کر اس نے انگلیوں کو جھٹک دیا اور مڑا۔اسے خیال آیا کہ سگریٹ وغیرہ کا بھی پوچھ لے۔ورنہ اس کے لیے پھر سے ایک پھیرا لگانا پڑے گا۔لیکن پھر شاید اس لیے کہ وہ دروازے تک پہنچ چکا تھا' وہ خاموش رہا۔جاتے جاتے کمرے کا دروازہ یوں دھڑاک سے بند کر گیا کہ دیر تک دھماکے کی آواز کمرے میں گونجتی رہی۔

زمان خان کے نکلتے ہی اس نے قلم پھر سے فائل پر ڈال دیا اور ذرا پیچھے سرک کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔وہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد تھک گیا تھا۔وہ جانتا تھا دفتر والوں کا اوورٹائم لگانا زمان خان پر کیسا گراں گزرتا ہے۔سچ ہے اس کے لیے تو یہ بیگار ہی ہوئی۔جو اوورٹائم لگاتا ہے اضافی رقم تو اس کی تنخواہ میں جمع ہوتی ہے جبکہ زمان خان کے ہاتھ آتی ہے بے صلہ مشقت۔کئی بار دفتر کے ساتھیوں نے ایسا چاہا کہ زمان خان کی دفتری اوقات سے بعد کی زائد ڈیوٹی کے معاوضے کی بات اعلیٰ حکام سے کی جائے لیکن ایسا کبھی ممکن نہیں ہوسکا۔جبکہ اس نہایت نیک نیتی پر مبنی تحریک کو دبا دینے اور رد کر دینے میں پیش پیش خود زمان خان ہی تھا۔"ضرورت ہوگی تو ام خود پیسوں کی بات صاب سے کرے گا۔"

اسے اپنے آپ پر اس قدر اعتماد تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے خیرخواہ تمام دفتری رفقا بھی ایسا ہی سوچیں کہ اگر اب تک وہ ایسی کسی سہولت سے محروم ہے تو اس کی وجہ فقط اس کی قناعت پسندانہ طبیعت ہی ہے نہ کہ کچھ اور۔یوں وہ اپنی ہر محرومی کو قناعت پسندانہ طبیعت کی آڑ لے کر چھپا لینا چاہتا تھا۔لیکن اصل میں یہ زمان خان کی ہٹیلی انانیت پسندی' اور اس سے جڑا ہوا خوف تھا کہ اگر صاحب لوگوں نے اس کے دفتری رفقا کی اس اجتماعی درخواست کو رد کر دیا اور اس پر کسی فیصلے کو ٹال مٹول سے کام لے کر التوا میں ڈالنے کی کوشش کی تو زمان خان کیا خجالت سے مر ہی نہ جائے گا۔ہوسکتا ہے خفت کے مارے وہ یہ دفتر ہی چھوڑ دے۔

... خیر معاملہ کبھی صحیح طور پر حل نہیں ہو پایا۔وہ ہر اوورٹائم کرنے والے کے ساتھ رات گئے تک دفتر میں بیٹھتا۔خود دفتر کو تالا لگاتا۔صبح سب سے پہلے آ کر دفتر کا دروازہ کھولتا۔دفتر کی چابیوں کی ایک نقل صاحب لوگوں کے پاس بھی تھی لیکن یہ ڈیوٹی تو اسی کی تھی کہ بلاناغہ صبح سب سے پہلے آ کر دروازہ کھولے۔رخصت کی اجازت چاہے مل جائے، صبح دفتر کھولنے کی ڈیوٹی بہر حال اسی

کو پوری کرنا پڑتی۔ لیکن وہ ان بندشوں پر نالاں نہیں تھا۔ مختلف توجیہات اور وجوہات کی بنا پر، جن سے اغلباً وہ خود بھی ناواقف تھا، اس نے خود کو بہت مطمئن کر رکھا تھا، بہت قانع اور آسودہ۔

بارہ برس پہلے، یعنی اس دفتر ''امیجز ایڈورٹائزنگ'' میں بطور چوکیدار بھرتی ہونے سے کوئی سات سال قبل، وہ ایک فارورڈنگ ایجنسی، نوروز ٹرانسپورٹ کمپنی، میں ٹرک ڈرائیور کی حیثیت سے ملازم تھا۔ کمپنی نے، اس کے باوجود کہ وہ اپنے کام میں خوب مشاق تھا اور اپنے چھ سالہ عرصہ ملازمت میں اس سے کبھی کوئی معمولی سا بھی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا تھا، اسے ملازمت سے فارغ کر دیا، صرف اس لیے کہ وہ بہت زیادہ چرس پیتا تھا۔ عموماً نہ وہ مال کو وقت پر مقررہ جگہ سے ٹرک میں لوڈ کرواتا اور نہ مال کی ڈلیوری ہی اس سے بروقت ہو پاتی۔

پشاور سے لاہور اور ملتان اور کراچی تک مال لے کر جاتا تھا۔ رات کو سفر کرتا اور دن کو آرام۔ لمبے سفر پر ہوتا تو کئی کئی دن سوئے بغیر ڈرائیونگ کرتا۔ راستے میں جگہ جگہ ٹرک روکتا، سگریٹ بھرتا اور پیتا۔ سو بسا اوقات پورا پورا دن دیر سے مقررہ جگہ پہنچتا۔ ایسے غیر ذمہ دار، ست الوجود انسان کی موجودہ دفتر میں حیرت انگیز طور پر مطلق برعکس ساکھ تھی۔ چرس تو چرس، سگریٹ پیتے ہوئے بھی کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ نسوار بھی نہیں، جس کے بغیر کہا جاتا ہے کہ پٹھان کا سانس درست نہیں چلتا۔

''اوئے خوچہ! میری مرضی میں نہیں پیتا۔'' اس سے ترک چرس نوشی کی وجہ پوچھی جاتی اور پھر اصرار کیا جاتا تو وہ برہم سا ہو کر کچھ ایسا ہی جواب دیتا۔ دراصل جو بات اسے فوری طور پر سمجھ نہ آئے، اس پر وہ جھنجھلا اٹھتا۔ ہر وہ بات اور سوال جو اسے سوچنے پر مجبور کرے، اسے برہم کر دیتا تھا۔ کبھی وہ مصالحتی انداز میں کہتا ''خوچہ! اچھا ہی ہے، چرس نہیں پیتا تو یہی پیسہ گھر بار پر خرچ کرتا ہے۔ حرام کی کمائی نہیں ہے کہ نشہ پر اڑا دوں۔''

نوروز ٹرانسپورٹ کمپنی سے نکل کر زمان خان لاہور چلا آیا۔ اپنے آبائی گاؤں ہری پور کی طرح یہاں بھی اس کا دل لگ گیا۔ کچھ عرصہ اِدھر اُدھر اڈوں پر بیٹھتا رہا۔ پھر شاہ جمال کے مزار پر گیا تو وہیں کا ہو رہا۔ دن میں کچھ کام وام کر کے تھوڑے بہت پیسے چرس خریدنے کے لیے کما لیتا۔ کھانا لنگر سے کھاتا اور رات کو مزار کے پچھواڑے میں شہر بھر کے چرسیوں کے سب سے بڑے اڈے یعنی قبرستان میں پڑا رہتا۔ کبھی زیادہ پیسے ہوتے تو شاہی محلے کا رخ کرتا جہاں

شیخوپوریاں محلے میں نسیم کا ڈیرا اس کا محبوب ٹھکانہ تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہاں اسے اپنی ہی قوم اور برادری کی عورتیں، جوارد گرد کے علاقے سے کمیشن پر دھندا کرنے آتی تھیں، دستیاب ہو جاتی تھیں۔ انہی میں ایک زیتون بانو تھی۔

زیتون بانو ہی پر کیا موقوف، ایک عرصے تک دفتر کے رفقا کو زمان خان کے بارے میں یہی معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کبھی چرس یا سگریٹ ہی پیتا تھا۔ بہت دور کے واسطوں سے یہ خبر ان تک پہنچی۔ خود زمان خان نے کبھی اپنے ماضی سے متعلق کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کے چہرے کے نقوش، رخسار کی سلوٹوں اور پیشانی کی شکنوں میں ایسی واضح کرختگی موجود تھی کہ کسی کو اس سے بے تکلف ہونے کی کبھی ترغیب نہ ہوئی۔ جبھی خاص ایسے معاملات کی سُن گن رکھنے والے کاپی پیسٹر نیاز بیگ نے کسی طور یہ کھوج نکالا کہ نوروز گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کی نوکری سے زمان خان نے استعفیٰ نہیں دیا تھا بلکہ اسے کثرت چرس نوشی کے باعث وہاں سے برخاست کیا گیا تھا۔ دفتر کے دیگر رفقا کے لیے یہ خبر ایک صدمے سے کم نہ تھی۔ زمان خان اور چرس نوشی! ''ارے وہ تو سگریٹ بھی نہیں پیتا۔'' پہلے پہل کسی نے اس کا یقین نہیں کیا لیکن جب انھوں نے زمان خان سے کرید کی تو اس نے خود ہی تصدیق کر دی۔

''خان صاحب! سب کچھ ایک دم چھوڑ دیا؟ کیسے؟'' زمان خان کی پیشانی پر شکنوں کی تعداد اور تناؤ بڑھ جاتا۔

''بس چھوڑ دیا صاب۔'' ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ چھوڑ دیا تو چھوڑ دیا، اس میں کیوں، کب اور کیسے کا کیا سوال! کم از کم زمان خان ایسے سوال کو نہیں مانتا تھا۔

پھر تو سبھی کو چُل ہوئی کہ معلوم کیا جائے، زمان خان کی زندگی میں یہ انقلاب کیونکر آیا۔ ضرور کوئی بڑا حادثہ ہوا ہوگا، کوئی انقلابی واقعہ، جیسا فلموں میں ہوتا ہے یا ناولوں میں، رومانس اور سسپنس سے مملو کوئی المیہ۔ لیکن زمان خان کی زندگی میں تو ایسا کوئی واقعہ شاید کبھی نہیں ہوا تھا، کم از کم ایسا واقعہ جس پر مبنی کوئی کامیاب فلمی کہانی لکھی جا سکے۔ کیونکہ زیتون بانو ایک عام سی، مسکین، بے چاری اور بدکار عورت تھی جو کسی رومانس اور سسپنس سے بھرے ناول کی ہیروئن نہیں ہو سکتی تھی۔ اس جیسی ہر دوسری عورت کی مانند اس کی زندگی بھی روزمرّہ کی سفاک یکسانیت اور استحصال کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔

وہ شام ہوتے ہی بازار سید مٹھا سے، جہاں اس کا گھر تھا، یہاں چلی آتی تھی۔ اکثر بچی کو بھی ساتھ لے آتی جو تب صرف ڈیڑھ برس کی تھی اور اس کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ٹکتی تھی۔ ابھی تو وہ بچی ہی تھی۔ جب اس عمر کو پہنچے گی کہ اس پر بھی نور آئے تو ضرور اچھے دام کمائے گی۔ اس کی نیلی آنکھیں، ہلکے بھورے بال، سرخ وسپید جلد تھی جو کسی پٹھان ہی کی دین معلوم ہوتی تھی۔ ظاہر ہے زمان خان پہلا مرد نہیں تھا جو اس کے کسے ہوئے حسین بدن سے واصل ہوا تھا۔ وہ ہر روز رات گئے تک عموماً پانچ سے بیس گاہک بھگتا لیتی تھی۔ دلال ڈھائی سو یا تین سو روپے میں گاہک گھیر کر لاتا۔ تیس ایک روپے وہ پہلے ہی کھرے کر لیتا۔ اتنے ہی روپے فی گاہک سنتری بادشاہ کی جیب میں جاتے۔ کوئی بیس ایک علاقے کے ٹھیکیدار کو ملتے اور باقی میں سے کوئی ستر پچھتر کے لگ بھگ اس کے حصے میں آتے۔ باقی ڈیرے دارنی لے جاتی۔ عام مندے کے حالات میں بھی اسے تین ایک سو کی دیہاڑی لگ جاتی۔ کوئی میلہ تہوار ہوتا، جیسے داتا گنج بخشؒ کا میلہ یا عیدیں، تو آس پاس کے دیہاتوں سے آئے ہوئے تماش بین اس کی خوب کمائی کراتے۔

خیر اوروں کے لیے نہ سہی زمان خان کے لیے البتہ وہ پہلی عورت تھی۔ پہلی بار تو ایک ہی ٹائم کے لیے اس کے پاس ٹھہرا۔ لیکن اس ایک بار سے جیسے اس کی تشنگی اور بڑھ گئی۔ پھر وقفے وقفے سے آنے لگا۔ جب بھی آتا ڈیرے دارنی کو رات بھر کے ٹائم کے پیسے دیتا۔ زیتون بانو اس رات وہیں ٹھہرتی۔ وہ اسے خوب بھنبھوڑتا، جس کا عورت کو ابتدا میں تو لطف آتا لیکن دوسری تیسری دفعہ کے بعد جب وہ پھر سے اس سے زور آزمائی کرتا تو وہ کسمسانے لگتی اور باقی رات یونہی اس کے چرس کے نشے میں دھت کھردرے جسم تلے کراہتی۔ لیکن کبھی اسے پرے ہٹنے کو بھی نہ کہتی۔ حتیٰ کہ آخر وہ خود بھی کراہنے لگتا۔

ایسی ہی ایک رات وہ تھک جانے کے بعد عورت پر سے اترے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا، ''مجھ سے شادی کرو گی؟'' عورت ناک کی سیدھ میں چھت کو تکے جا رہی تھی۔ وہ پلکیں جھپکے بنا اسے سنا کی اور چپ رہی، جیسے کچھ بھی نہ سن پائی ہو یا چاہتی ہو کہ وہ پھر سے یہی بات کہے یا کچھ اور بھی کہے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ دونوں نے خاموشی کے ساتھ کپڑے پہنے۔ کوٹھڑی سے نکل کر وہ اندرونی کمروں کی طرف چلی گئی جہاں اس کی بیٹی سو رہی تھی اور زمان خان باہر کی سیڑھیوں کی طرف ہولیا۔

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں جب وہ تنگ و تاریک گلیوں سے ہوتا ہوا ایک کھلے بازار میں پہنچا۔ ایک سرکاری نلکے سے اس نے پانی کے چھینٹے چہرے پر مارے اور کیچڑ بھرے سیاہ پانی سے بھری نالی میں تھوکا۔ اس دن کے بعد اس نے پھر کبھی اس عورت سے رجوع نہ کیا۔ بلکہ کبھی اس بازار ہی کا رخ نہ کیا۔

زیتون بانو نے ضرور اس کی راہ دیکھی ہوگی۔ حتی کہ پھر ایک دن وہ اس کے آنے کی امید کھو بیٹھی ہوگی۔ وہ چاہتی ہوگی کہ وہ پھر سے آئے اور اس سے یہی بات کہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ اسے ماننے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ایسا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ لیکن دل کو گہرا سکون اور لطف دینے والی اس بات کو سنا تو جا سکتا تھا۔ جب وہ جوان تھی اور نئی نئی بازار میں آئی تھی تو ہو سکتا ہے کہ کئی مردوں نے اس سے ایسی ہی بات کی ہو۔ تب یہ بات اس کے دل کے تاروں میں جھنجھناہٹ پیدا کرتی ہوگی۔ لیکن پھر بہت سے مردوں کی کہی ہوئی یہ بات اپنی تاثیر کھونے لگی اور ان سے متعلق یادیں بھی آپس میں خلط ملط ہو کر رہ گئیں۔ زمان خان تو بہت دیر بعد آیا تھا جب دریا اپنا رخ بدل چکا تھا۔

یہ بات تو خود اس کی بھی سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ کیوں پھر وہ کبھی شاہ جمال کے مزار پر بھی نہ گیا اور نہ ہی چرس کی طلب کبھی محسوس کی۔ تمبا کو نوشی، زنا کاری، یہ سب چیزیں نہایت خاموشی سے اس سے یوں چھٹ گئیں جیسے کسی منظر پر سے دھند چھٹ جائے۔ بس اس کا من بھر گیا۔ سادہ ترین وجہ تو یہی تھی اور یہی اس کے لئے کافی بھی تھی کہ اسے مزید چرس یا سگریٹ پینے یا رنڈی بازی کرنے کی خواہش نہ رہی تھی۔ امیجز ایڈورٹائزنگ کے ڈائریکٹر انور سعید کا مکان تعمیر ہو رہا تھا۔ زمان خان مزدوروں کی نفری میں شامل ہو گیا۔ مالک مکان کے دفتر میں چوکیدار کی آسامی خالی تھی۔ اس نے ٹھیکیدار کے ذریعے سفارش کروائی اور ملازم ہو گیا۔ اس بات کو بارہ برس بیت گئے تھے۔

اس بیچ اس نے اپنے آبائی گاؤں ہری پور جا کر برادری ہی کی ایک عورت سے بیاہ کر لیا تھا۔ اب اس کی دو لڑکیاں تھیں جو اسی کی طرح گوری چٹی تھیں۔ بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی۔ دفتر کے قریب ہی ایک کچے گھروں اور غیر پختہ گلیوں والی آبادی ہے جہاں اس نے اپنا ایک منزلہ مکان بنا لیا۔ آس پاس لوگوں کو بتانے کے لئے اس نے ایک فرضی ماضی بھی اختراع کر رکھا تھا جس پر شک کرنے کی کسی کو کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

لیکن زندگی کے بہت خاموش اور ٹھہرے ہوئے پانیوں جیسے ساکت لمحوں میں زمان خان زیتون بانو کو یاد کرتا تھا جوان بارہ برسوں میں اسی کی طرح بوڑھی ہو چکی ہوگی۔ وہ کسا ہوا ریشمی جسم، جسے ہر رات رگیدا جاتا اور جو بار بار کی پامالی سے کمھلانے لگا تھا، اب میلے کپڑے کی طرح غلیظ اور خستہ ہو چکا ہوگا۔ شاید اس کی بیٹی وہاں آتی ہو۔ کیسی نکھر آئی ہوگی وہ چھوٹی سی بچی۔ نیلی آنکھیں، بھورے بال، سرخ و سفید پٹھان بچی۔ کیا ہی مول ہوگا ایسے ہیرے کا۔ تب وہ سوچتا اور بڑے یقین کے ساتھ یہ خیال اس کے ذہن میں آتا کہ اگر تب وہ دوبارہ وہاں جاتا، دوسری مرتبہ اس سے شادی کا کہتا تو وہ ضرور مان جاتی۔ وہ اس خیال کو جھٹکتا۔ نہیں یہ سچ نہیں تھا۔ سچ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ہر مرد کی طرح وصال کے اختتامی لمحوں کی مستی میں اس نے بنا سوچے ہی یہ بات کہہ دی تھی۔ لیکن نہیں۔ شاید یہ سچ نہیں تھا۔ شاید وہ زیتون بانو کو۔۔ نہیں۔ نہیں۔ اب اگر ایسا ممکن ہو بھی تو یہ مناسب نہیں تھا۔ دل کی تیز ہوتی دھڑکن، آنکھوں میں جاگتی نمی اور سانس کی تیزی۔ یہ تو سب بڑھاپا ہے۔ جب گزری ہوئی کی باتوں کا رومانس بڑھ جاتا ہے۔

زیتون بانو کبھی پہلے اس کے دل میں تھی، نہ اب ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ زیتون بانو، زیتون۔ نہیں، نہیں، ہاں، نہیں، ہاں۔ وہ سر کو جھٹکتا، ماتھے پر شکنوں کے الجھاؤ اور تناؤ میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ تیز تیز زیر لب بڑبڑاتا۔ جبھی تو لوگ اسے کچھ ہلا ہوا، سنکی سا سمجھتے تھے۔ لیکن ان الجھاؤ بھرے لمحوں میں وہ ناک میں سے گند نکالتا رہتا۔ نم دار، سیاہ گند، جسے وہ چٹکی میں دباتا اور مروڑیاں سی بناتا، پھر دبا کر چپٹا کرتا، پھر مروڑی بناتا پھر دباتا پھر۔۔۔۔۔

اس نے سگریٹ سلگایا۔

ایک نئی ننگ مشین کی ایڈ کمپین پر وہ کام کر رہا تھا۔ صبح یہ فائل تیار ہو کر ڈائریکٹر کی میز پر ہوگی اور ڈائریکٹر خوش ہو کر کہے گا ''ویل ڈن مسٹر آصف'' تو اسے کیسی راحت ملے گی۔ ایسے موقعوں پر کیسے مستقبل اس کے لیے یکبارگی بہت روشن اور نکھرے ہوئے دن کی طرح ہو جاتا تھا' اجلا اجلا سا' ترو تازہ اور واضح۔

وہ اٹھ کر باتھ روم میں گیا۔ دھواں اگلتے سگریٹ کو ہونٹوں میں دبائے ہوئے اس نے پتلون کی زپ کھولی اور خود کو ذرا سا آگے جھکا لیا۔ ہمیشہ دھار پر وہ آخری قطرے تک نظر جمائے

رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ چاہے کیسے ہی رنگدار مشروب پیے جائیں' وہ نکلتے ایک ہی رنگ میں ہیں۔ بچپن میں یہ بات اسے ہمیشہ بہت تعجب خیز معلوم ہوتی تھی۔ اس نے دیکھا پیشاب کی رنگت سرخی مائل تھی۔ کیوں اسے ہمیشہ اندر گرمی رہتی ہے۔ اس نے تشویش کے ساتھ سوچا۔ وہ پانی شاید کم پیتا ہے۔ یا نیند کی کمی کی وجہ سے تو نہیں تھا یہ سب کچھ۔ طاقت کی گرمی تو نہیں ہو سکتی یہ۔ وہ مسکرایا اور زپ اوپر چڑھائی۔

راہداری سے ہو کر وہ پھر سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہ اس ادارے کا کاپی رائٹنگ سیکشن تھا۔ کل چار لوگ یہاں بیٹھتے تھے۔ تین کاپی رائٹر ایک کمرے میں اور ان کا انچارج ملک شجاع برابر کے کمرے میں' جو بیک وقت آرٹ ڈائریکٹر اور چیف کاپی رائٹر تھا۔

''باؤ جی! پھڑ کدا ہو یا کم ہووے۔'' جب ملک شجاع خود کوئی کیپشن تیار نہ کر پاتا تو اپنے عملے میں سے کسی کو بلا کر اس کے ذمے یہ کام لگا دیتا۔ ''سمجھ گئے او باوا جی؟ دل نوں وجے، ایہو جیہا کجھ لکھ کے لیاؤ۔ جاؤ شاباش، کم کرو کم۔'' وہ سگریٹ کے تیز تیز کش لگاتے ہوئے بلند آواز میں کہتا جیسے کسی ایک فرد سے نہیں' دفتر بھر سے مخاطب ہو۔ لیکن کوئی ایسا کیپشن لکھنا جو' دل نو وجے' جیسے سخت معیار پر پورا اترے کار سہل نہیں تھا۔ یہ ایسا معیار تھا جس پر کم از کم اس کے لیے کسی بھی دوسرے کا لکھا ہوا کیپشن کبھی پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ غیر ملکی کمپنیوں کے انگریزی کیپشنوں سے وہ اپنا معیار اخذ کرتا تھا۔

''کم انگریز دا ای اے، بس!'' وہ کسی اچھے انگریزی کیپشن کو پڑھتے اور سر دھنتے ہوئے لفظ چبا چبا کر بولتا۔ خود کھڑی پنجابی بولتا، لیکن جو کوئی بات کرتے ہوئے انگریزی کے چند الفاظ یا فقروں کا لشکارا مار دیتا تو فوراً مرعوب ہو جاتا جیسے انگریزی اس کی کوئی دکھتی رگ تھی۔ اردو اور پنجابی کا ہر کیپشن اس کی موٹے شیشوں والی عینک کے عقب سے جھانکتی آنکھوں میں کھنچاؤ اور رخساروں کی سلوٹوں میں ہلکا ہلکا طنزیہ تبسم بھر دیتا۔ اپنے لکھے ہوئے کیپشن کی البتہ وہ ہمیشہ کھول کر داد وصول کرنے کا متمنی رہتا۔ عملے کے لوگ اس کی کمزوری سے آگاہ تھے۔ سو داد و تحسین کے ڈونگے لنڈھانے میں کبھی خست کا مظاہرہ نہ کرتے کہ یہی مصلحت کا تقاضہ بھی تھا۔ عملے سے اسے نہ صرف اپنے لکھے ہوئے ہر کیپشن کے بہترین ہونے کی فوری تائید مل جاتی بلکہ پرزور اصرار بھی کیا جاتا کہ زیر غور پراڈکٹ کے لئے یہی موزوں ترین بھی ہے۔

اس نے سگریٹ کو، جس کے بھورے فلٹر کے اوپر کچھ سفیدی ابھی باقی تھی، کھڑکی کی چوکھٹ سے رگڑ کر باہر اچھال دیا۔ موسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ بھوک سے معدے میں کھنچاؤ بڑھ رہا تھا۔ نیچے کار پارکنگ کا خالی میدان تھا جس کے کنارے کنارے اونچے سرکاری کھمبوں پر قمقمے روشن تھے۔ اس تجارتی علاقے کا واحد کار پارکنگ ہونے کی وجہ سے یہ دن میں ہر سائز اور ماڈل کی گاڑیوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ لیکن رات ہوتے ہوتے بھوکے کے پیٹ کی مانند خالی اور برہنہ ہو جاتا۔

اس سے پرے سڑک کے دونوں اطراف میں شیشم اور جامن کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ دورویہ سڑک کے وسط میں سبز پٹی تھی جس پر چوکور آہنی جنگلوں کے اندر چھوٹے قد کے بوٹے لگے ہوئے تھے جنہیں دن بھر گاڑیوں کا دھواں اور ہر طرف دھند کی طرح پھیلا گرد کا غلاف کمھلائے رکھتا۔ یہ بوٹے مدتوں ننھی ننھی شاخوں کے ساتھ سیدھے کھڑے رہنے اور بلند ہونے کی کوشش کرتے اور آہستہ آہستہ مرجھا جاتے۔ انہیں ہوا کا سانس درست اور صاف رکھنے کے لئے اپنی بھینٹ دینا پڑتی تھی۔ لیکن ہوا مسلسل زہر آلود ہو رہی تھی اور بہت گھٹے ہوئے سانس لینے لگی تھی۔

گرمیوں میں جامن کے درختوں پر پھل آتا تو جھڑ جھڑ کر فٹ پاتھ کو ڈھانپ دیتا۔ راہ گیر اسے پیروں سے مسل دیتے۔ سلیٹی رنگ کا فرش جامنی دھبوں سے اٹ جاتا جو اس پر ماتا کے داغوں کی طرح چمکتے۔ یہ دھبے آپس میں مل کر مختلف بے ڈھنگے ڈیزائن ترتیب دیتے معلوم ہوتے۔ لیکن کوئی ان پر غور نہیں کرتا تھا اور غالباً یہ سارا رنگین اہتمام کسی کے لئے تھا بھی نہیں۔

دیواری گھڑی نے چھ کا گھنٹہ بجایا۔ زمان خان کو گئے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ ''وہ حسین چوک تک ہی گیا ہوگا۔ اپنے دل پسند چپلی کباب لینے۔'' اس نے سوچا۔ اسے ایک اور سگریٹ سلگانے کا خیال آیا لیکن پھر اس نے اسے ترک کر دیا۔ بہتر ہے کہ وہ کچھ کام کر لے۔ اسے یہ سوچ کر کوفت ہوئی کہ زمان خان کے آنے پر اسے پھر سے اٹھنا پڑے گا۔ وہ اپنی میز تک گیا۔ ریڈ اینڈ وائٹ کی ڈبیا میں سے سگریٹ نکالا اور ماچس کی تیلی جلا کر سلگایا۔ پھر کھڑکی کے پاس چلا آیا۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ لیکن ہوا کی خنکی خبر دیتی تھی کہ قریب ہی کہیں نم دار بادل موجود تھے۔ کہیں بارش ہوئی تھی یا ہو رہی تھی۔ موسم ایک دم سے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اسے یاد تھا پچھلے سال گیارہ دسمبر تک لوگوں نے سویٹر پہننا شروع نہیں کئے تھے۔ جوں جوں شہر میں آلودگی

بڑھ رہی تھی' موسموں کا مزاج غیر یقینی ہو رہا تھا۔ اچانک گرمی کا زور اس وقت ٹوٹ جاتا جب لوگ اس کی ہرگز توقع نہ کر رہے ہوتے، اور معاً سردی تب شروع ہو جاتی یا بڑھ جاتی جب بظاہر اس کے آثار تک موجود نہ ہوتے۔ اس کی ماں نے صبح اس سے مفلر پہننے پر کتنا اصرار کیا تھا۔ "ابھی تو سردی آئی بھی نہیں۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا اور یونہی گھر سے چلا آیا تھا۔ لیکن راستے میں وہ کرماں والا چوک سے ذرا پیچھے ایک گلی میں لحہ بھر کو ٹھٹکا تھا جہاں لکڑیوں کے ایک ٹال میں اس نے ایک پٹھان اور اس کے دو بچوں کو میلے مفلر چہرے کے گرد لپیٹے چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے گٹھوں پر بیٹھے دیکھا تھا۔' سردی تو ہے" تب اسے محسوس ہوا کہ اس نے ماں کو یوں سختی سے جواب دے کر اچھا نہیں کیا تھا۔ نیچے فٹ پاتھ پر اسے چند راہ گیروں کے درمیان زمان خان دکھائی دیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے بھاری قدم بھرتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے اخبار میں لپیٹے نان پکڑے ہوئے تھے۔

اسے ٹھیک یاد تھا جب وہ کھانا کھانے کے بعد چکنائی سے آلودہ ہاتھ دھو کر غسل خانے سے نکلا تو پونے سات ہوئے تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا تھا۔ زمان خان اسٹول پر بیٹھا دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا اور بار بار اس کا سر اس کے ایک کندھے کی طرف ڈھلک جاتا۔ خوراک اس کے معدے میں پہنچ کر الکحل بنا رہی اور اس کا دماغ خمار کے سایوں میں ڈول رہا تھا۔ وہ سانس لیتا تو گلے میں سے سؤر کی سی خرخراہٹ برآمد ہوتی اور نتھنے تیز ہوا میں کپکپاتے، کپڑے کی طرح پھڑکتے۔ کبھی کبھی خرخراہٹ گلے سے نکل کر ناک میں پھنستی محسوس ہوتی۔ تب یوں لگتا جیسے وہ کچھ بڑبڑا رہا ہو۔ جیسے خواب میں خود کلامی کر رہا ہو۔

اس نے اپنے کام کے آخری مرحلے پر پہنچتے ہوئے کیلکولیٹر آن کیا تھا' جب دیوار گیر گھڑی نے گھنٹہ بجایا۔ وہ ایک نئے ماڈل کی ننگ مشین کے ٹی وی پر تین ماہ تک سلز چلانے کے اخراجات کا حساب لگا رہا تھا۔ اس نے کام روک کر بجنے والے گھنٹے گنے۔ کل سات تھے۔ پھر کاغذ پر لکیریں لگائیں اور کالم بنا کر رقم کا اندراج کرنے لگا۔ بس اسی بیچ کام میں اس کا من یوں لگا کہ وقت گزرنے کا احساس باقی نہ رہا۔

دیوار پر لگی گھڑی نے گیارہ کا گھنٹہ بجایا تو وہ ہڑبڑا کر چونکا جیسے کسی نے اسے سوتے میں جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ اس نے گیارہ گھنٹوں کی ٹن ٹن ٹن سنی اور حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گردن موڑ کر گھڑی میں وقت دیکھا جیسے اسے اپنے کانوں پر بھی اعتبار نہ رہا ہو۔ واقعی گیارہ

بجے تھے۔اتنی دیر اسے دفتر میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ پتہ نہیں اس وقت کوئی ویگن بھی اسے ملے یا نہیں۔فوری طور پر اس نے کاغذات سمیٹے۔ جو تھوڑا کام رہ گیا تھا' اسے وہ صبح ابتدائی دو ایک گھنٹوں ہی میں نپٹا لے گا۔ کاغذات کو اس نے فائل میں رکھا اور فائل کو میز کی بالائی دراز میں۔ نچلی دراز کے کونے میں اپنے تعارفی کارڈز کے بنڈل کے نیچے سے بالائی دراز کی چابی نکالی۔ دراز بند کی اور چابی پھر سے ننھے بنڈل کے نیچے چھپادی۔

کمرے میں زمان خان کے باقاعدہ خراٹوں کے علاوہ جو دوسرا شور گونج رہا تھا' وہ بیسن کے نلکے سے پانی کے قطروں کے ٹپ ٹپ گرنے کا تھا۔ اس نے کچن میں جھانکا۔ شور کا منبع وہاں نہیں تھا۔ باتھ روم میں جا کر ٹونٹی کو کس کر بند کیا۔ پھر ٹھوکا دے کر زمان خان کو جگایا۔ ہمیشہ کی طرح وہ فوراً ہی ہڑ بڑا کر جاگا، لیکن دیر تک ہونقوں کی طرح خالی نظروں سے بٹر بٹر اسے تکا کیا جیسے وہ دیکھ تو رہا تھا لیکن اس کا دماغ ہنوز خوابیدہ تھا اور وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یہ سمجھ لینے میں کہ وہ جاگ اٹھا ہے' اپنے دفتر مین ہے اور اس کے سامنے اس کے دفتر کا ایک رفیق کھڑا ہے' اسے کچھ وقت لگا۔ اس نے اشارے سے زمان خان کو بتایا کہ وہ کام ختم کر چکا ہے، رات کافی بیت چکی ہے اور یہ کہ اب وہ جا رہا ہے۔ پھر یہ دیکھے بغیر کہ زمان خان اس کی بات کو سمجھ بھی پایا تھا کہ نہیں، وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ جبھی زمان خان کی آنکھوں سے خواب کا پردہ ہٹا اور وہ پوری طرح بیدار ہو کر اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دفتر کی چابیاں اس نے اپنی شلوار کے نیفے سے باندھی ہوئی تھیں، ہاتھ لگا کر ان کی موجودگی کا یقین کیا۔ پھر بتیاں بجھانے اور دیکھنے کے لئے کہ سبھی کھڑکیاں دروازے بند ہیں، وہ دوسرے کمروں کی طرف بڑھ گیا۔

خاموش اور ٹھنڈے زینے کو اس نے دبے پاؤں عبور کیا۔ اس روحوں کے مسکن جیسے خاموش اور پراسرار زینے میں اس کے پیروں کی چاپ کنویں میں گرتے پتھر کی طرح گونجتی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسی گہری اور کھنک دار گونج اس کی سماعت سے آ کر ٹکراتی تھی کہ اس کا عجلت کے مارے تیز تیز دھڑکتا دل خوف سے تھم تھم جاتا۔ باہر فٹ پاتھ پر آ کر اس نے یوں گہرا سانس لیا جیسے اب تک سانس روکے ہوئے تھا۔ دھند کی وجہ سے سرکاری کھمبوں پر قمقمے مدھم اور اداس معلوم ہو رہے تھے۔ بہت دور کسی پر رونق سڑک کی ٹریفک کا بہت دھیما شور سنائی دے رہا تھا جو پل پل رخ بدلتی ہوا کے ساتھ وقفے وقفے سے غائب ہو جاتا۔

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ گیارہ بج کر سات منٹ ہوئے تھے۔ اس وقت مین مارکیٹ، جو اس کے دائیں طرف کوئی سات ایک منٹ کی مسافت پر تھی، کے سٹاپ سے تو کوئی ویگن ملنے سے رہی۔ بلکہ امکان اس بات کا تھا کہ آس پاس نہ تو کوئی دکان کھلی ہو گی اور نہ رکشہ یا ٹیکسی ہی کہیں مل پائے گی۔ حیدری چوک میں، جہاں بہر کیف اسے جانا ہی پڑے گا، نہ صرف دکانیں کھلی ہوں گی بلکہ رکشہ اور ٹیکسی کے علاوہ آخری ٹائم کی ویگنوں کے ملنے کا امکان بھی تھا۔ کوئی بیس پچیس منٹ کی مسافت تھی۔ تو بہتر ہے وہ سیدھا حیدری چوک ہی جائے۔ اس نے جیسے طے کر لیا لیکن جب چلنا شروع کیا تو خود بخود اس کے قدم جیسے سدھائے ہوئے جانور کی طرح دائیں جانب مین مارکیٹ کی طرف ہو لئے۔ اس نے خود کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس ہشت منزلہ عمارت کے ساتھ ساتھ، جس کی پانچویں منزل میں اس کا امیجز ایڈورٹائزنگ کا دفتر واقع تھا، خاصا چوڑا فٹ پاتھ بچھا تھا جو ایسی ہی دو تین مزید عمارتوں سے لپٹا ہوا کوئی سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر مین مارکیٹ پہنچ کر دم لیتا تھا۔

ڈیوچے بنک کے آگے فٹ پاتھ کے چمکدار اور چکنی ٹائلوں سے بنے مختصر قطعے پر سے گزرتے ہوئے اسے کچھ فاصلے پر سپر ڈیپارٹمنٹل سٹور کے بورڈ کے نیچے ایک الاؤ روشن دکھائی دیا۔ اس سردی میں الاؤ کو دیکھنے ہی سے اسے اپنے اندر خوش گوار حدت کا احساس ہوا۔ ذرا آگے بڑھنے پر اسے الاؤ کے برابر ایک لحیم شحیم فربہ بھکاری چیتھڑوں میں ملبوس کھڑا دکھائی دیا۔ بھکاری کو دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ بھکاری وقفے وقفے سے آگے کی طرف یوں جھکتا جیسے رکوع میں جا رہا ہو۔ وہ سامنے پڑے کاغذ اور گتے کے ٹکڑوں، لکڑی کی چھپٹیوں اور ایسے ہی کاٹھ کباڑ کے ڈھیر میں سے کچھ ایندھن اٹھاتا اور اسے الاؤ میں جھونک دیتا۔ فوری طور پر شعلوں کی سرخ زبانیں زیادہ بلند ہو کر لہراتی ہوئی باہر لپکتیں اور قریب ہی دیوار سے لگے لوہے کے بڑے بکسے کو چاٹنے لگتیں جس میں اسے فاصلے سے بھی صاف دکھائی دے رہا تھا کہ بجلی کی سپلائی کا مین سوئچ تھا۔ ظاہر تھا یہ شعلے اگر کچھ دیر مزید یونہی بکسے کو چاٹتے رہے تو ان تاروں میں شعلہ بھڑک سکتا تھا جو مین سوئچ سے جڑی ہوئی تھیں اور پھر اس کے بعد کچھ بھی سنگین واقعہ ہو سکتا تھا۔ وہ تذبذب کے ساتھ کچھ دیر یونہی کھڑا بھکاری اور الاؤ کو تکتا رہا۔

پھر بے دھیانی میں اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ فٹ پاتھ کے برابر زیر زمین گندے پانی

کی نالی کے منہ پر، جولوہے کی جالی سے ڈھکا ہوا تھا، اسے اینٹ کا ٹکڑا پڑا دکھائی دیا۔ اس نے اسے اٹھالیا۔ وہ گیلا تھا۔ کچھ دیر اسے ہاتھ میں تولا۔ پھر ہاتھ فضا میں بلند کیا اور اینٹ بھکاری کی طرف اچھال دی۔ غیر متوقع طور پر وہ سیدھی بھکاری کے پیروں کے قریب یا شاید پیروں ہی میں جا گری جس سے دفعتاً بھکاری ہڑ بڑا کر ایک قدم پیچھے اچھلا۔ پھر پہلے اینٹ کو دیکھا جو اس کے پیروں کے پاس پڑی تھی اور پھر سر اٹھا کر اسے۔ سرخ انگارہ آنکھوں سے بھکاری غصیلے جانور کی طرح پھنکارتا ہوا اسے تک رہا تھا۔

''ہو۔۔۔ہو۔۔۔ہش۔۔ بھاگو۔۔ بھاگو یہاں سے!'' وہ بازو کو فضا میں جھٹکتے ہوئے پوری قوت سے چلاّیا۔ بھکاری یونہی کسی پرندے کی طرح، جس کے بڑے بڑے پر طویل اڑان کے باعث کٹ پھٹ چکے ہوں، چیتھڑوں میں لپٹے بازو ڈھلکائے کھڑا تھا۔ ظاہر ہے اس پر اس بے ضرر تنبیہ کا کیا اثر ہونا تھا۔ کچھ توقف کے بعد وہ پھر سے پکارا ''ہئے۔۔ ہو۔۔۔ہو۔۔۔ ہش۔۔ہش۔۔ہش۔۔''

بھکاری نے تھوڑا سا جھک کر الاؤ میں سے لکڑی کا لمبا موٹا ٹکڑا باہر کھینچ لیا جس کے ایک سرے پر آگ بھڑک رہی تھی۔ پھر جلتی ہوئی لکڑی کو ہوا میں بلند کیا اور اچانک ہی تیز قدم اٹھاتا بالکل سیدھی اور متوازن چال میں اس کی طرف بڑھا۔ وہ اپنا ریچھ جیسا بھورا اور میلا جسم جھلاتے ہوئے، جو کسی لے پر رقص کرتا معلوم ہوتا تھا، اور اپنے بھاری بھرکم پیر زور زور سے زمین پر مارتے ہوئے اسکی طرف بھاگا آ رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ پایا کہ بھکاری کی اس حرکت کا کیا مطلب تھا؟ لیکن اس کی حسیات نے بیدار ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیا اور فوراً ہی اسے اپنی طرف بڑھنے والے خطرے کے بارے میں کسی قسم کا شک باقی نہ رہا۔

اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ اسے دکھائی دیا کہ زمان خان سائیکل لیے عمارت کے پھاٹک سے باہر نکل رہا تھا۔ اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ زیادہ بہتر تھا وہ فوری طور پر زمان خان کے پاس چلا جائے جہاں وہ اس مجنون بھکاری کا مقابلہ کرنے کی زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوگا۔ وہ زمان خان کی طرف بڑھا جو اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا اور پھر جیسے معاملے کو سمجھتے ہوئے اس نے پیر سے سٹینڈ کو نیچے کھینچ کر سائیکل کو کھڑا کر لیا۔

تاہم اس سے پیشتر کہ وہ زمان خان تک پہنچے یا زمان خان خود اس تک آئے، اس کے عقب

سے بھکاری بلغمی اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا ''او خان! زمان خانا اس حرام کے تخم کو پکڑو۔ چوری کر کے بھاگتا ہے۔ خنزیر کا بچہ۔''

زمان خان نے دونوں بازو دائیں بائیں کولھوں پر جما لیے اور اس پر نظریں گاڑے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا جیسے وہ کسی راہ گم کردہ جہاز کا کپتان ہو اور عرشے پر کھڑا نظروں کی حد پر ابھرتے دور کسی ساحل کو اشتیاق بھری نظروں دیکھ رہا ہو۔ اس کے قریب پہنچتے ہی زمان خان نے بازوؤں کو حلقے کی صورت میں پھیلایا اور اسے اپنے کلاوے میں لے لیا جیسے چیل چوزے کو دبوچتی ہے۔ زمان خان کے اس غیر متوقع ردعمل پر وہ ٹپٹایا اور اس کے بازوؤں میں کسمسایا۔ لیکن گرفت آہنی شکنجے جیسی سخت اور مضبوط تھی۔ اس نے گردن پھیر کر عقب میں دیکھا۔ بھکاری دیوانہ وار بھاگنا موقوف کر چکا تھا اور ایک ٹھہری ہوئی دھیمی اور فاتحانہ چال سے اسکی طرف بڑھ رہا تھا۔ جلتے ہوئے سرے والی لکڑی ہنوز اس کے ہاتھ میں تھی۔

''یہ کیا مذاق ہے زمان خان؟ مجھے چھوڑ دو!'' وہ طیش اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ تیز آواز میں بولا۔ وہ جتنا خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا، گرفت اور زیادہ سخت ہو جاتی۔ حتیٰ کہ اسے اپنی سانس گھٹتی محسوس ہوئی اور اسے لگا اگر کچھ دیر مزید اسی حالت میں رہا تو اس کا دم نکل جائے گا۔ اس نے ایک بار پھر جسم کو جھٹکا دے کر زور لگایا اور سر اٹھا کر زمان خان کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی سانسوں میں نسوار کی بو رچی ہوئی تھی جس سے اسے قے آتی محسوس ہوئی۔ 'کیسا خر دماغ آدمی ہے' اس نے جھنجلاہٹ میں سوچا۔

''یہ کوئی مذاق کا وقت ہے؟ دیکھتے نہیں ہو۔ پاگل ہے وہ۔ میں نے اسے آگ جلانے سے روکا تھا۔ ادھر دیوار پر مین سوئچ کا بورڈ دیکھ رہے ہو۔ خود ہی سوچو۔ آگ تاروں کو جلاتی تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ساری بلڈنگ جل سکتی تھی۔ میں نے تو بس اسے روکا تھا کہ آگ نہ جلائے۔ یہ مجھ پر چڑھ دوڑا ہے۔ تم اسے جانتے ہو؟''

زمان خان نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ وہ اسے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اپنا بڑا سا چہرہ اٹھائے، جس پر چند دنوں کی خشخشی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، وہ سامنے بھکاری کو تکے جا رہا تھا جبکہ اس کی آنکھوں میں بھکاری کے لیے شناسائی کی واضح چمک موجود تھی۔

کچھ دیر اوپری سی مزاحمت کرنے کے بعد اس نے پوری قوت سے جسم کو جھٹکا، کہنیوں کو اس

کی چھاتی پر ٹکا کر زور لگایا۔ لیکن گرفت کم ہونے کی بجائے اور سخت ہوگئی۔

''زمان خان!'' وہ طیش میں چلایا یوں جیسے ہذیان بکنے لگا ہو۔ منہ سے تھوک کے چھینٹے اڑ کر زمان خان کے چہرے پر گرنے لگے۔ ''کیا پاگل پن ہے؟ دماغ تو صحیح ہے تمہارا؟ میں ڈائریکٹر صاحب سے شکایت کروں گا۔ دیکھنا تمہاری چھٹی کرادوں گا۔ یہ کوئی مذاق ہے۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ چھوڑو مجھے، چھوڑ دو!'' وہ دوبارہ زور لگانے لگا۔ بس تبھی زمان خان نے بازوؤں کو جھٹکے سے بھینچا۔ یوں کہ اس کی ہڈیاں چٹخنے کی تڑاتڑاہٹ پیدا ہوئی اور گلے سے درد کی گھٹی ہوئی آہ نکلی۔ ایسا شدید جھٹکا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ زمان خان کے بازو وہ تلواریں تھیں جو اس کے جسم کے آر پار ہوئی جاتی تھیں اور سانس جیسے اندر سما نہیں پا رہی تھی۔ وہ ہانپنے لگا۔ جسم کا سارا خون سر کو چڑھ آیا تھا اور اس ارتکاز سے اسے اپنا چہرہ جلتا ہوا اور آنکھیں انگارہ معلوم ہوئیں۔

کچھ ایسا ہی لمحہ تھا جب خوف نے اس پر غلبہ پایا۔ اسے یہ بات سمجھنے میں اب کوئی دشواری نہیں تھی کہ اسے قتل کیا جا رہا تھا۔ یہ ڈکیتی کی واردات نہیں تھی۔ یہ مجنون بھکاری، جو زمان خان کا جاننے والا تھا، اصل میں اسی کی گھات میں وہاں کھڑا تھا کسی پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت۔ اگر وہ اسے پتھر نہ مارتا، تب بھی وہ اس پر حملہ کرتا۔ وہ ان کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔ بے چارگی اور بے بسی کے ذلیل احساس نے اسے گھائل کیا اور وہ اپنے سوجے ہوئے منہ کے ساتھ زمان خان کی شہ رگ میں کسی پھوڑے کی طرح باہر نکلے نرخرے کو تکنے لگا۔ 'لیکن یہ اسے قتل کیوں کرنا چاہتے تھے'؟

''تم کیا چاہتے ہو؟'' وہ گھگھیایا۔ ''پیسہ چاہتے ہو؟ میں تمہیں پیسہ دیتا ہوں۔ میرے بٹوے میں سات سو روپے ہیں یہ میری گھڑی بھی لے لو۔ اوپر میز کی دراز میں بھی کچھ پیسے ہیں۔ میں گھر سے بھی لا کر دے دوں گا۔ تم جو چاہتے ہو، وہ میں کروں گا۔ مجھے مت مارو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے مارنے سے بھلا تمہیں کیا فائدہ؟ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ مجھے مت مارو۔'' اس کے ذہن میں تیزی سے اخبارات کی ایسی خبریں گردش کرنے لگی تھیں جو ان لاوارث لاشوں کے بارے میں آئے دن چھپتی رہتی تھیں جو شہر کے تاریک گوشوں میں پڑی ہوئی ملتیں۔ ایسا ہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا۔ اسے لگا جیسے وہ کسی انجانے رابطے سے ان تمام

مرنے والوں کی برادری میں شامل ہو گیا تھا۔

وہ اس کے بازوؤں میں لوتھڑا سا، بے بس وجود، یوں رونے لگا کہ ہچکی بندھ گئی۔ پورا گلا کھول کر وہ بہ آواز بلند گریہ کر رہا تھا۔ لیکن یہ گریہ بغیر آنسوؤں کے تھا۔ آنکھوں سے چھلکنے کی بجائے یہ گریہ کہیں اندر ہی جاری تھا۔ تبھی تو وہ مٹی کی دیوار کی طرح اندر ہی اندر گھلتا اور ڈھہتا جا رہا تھا۔ تب آخری مرتبہ اپنی پوری قوت جمع کر کے اس نے پیر کی ٹھوکر زمان خان کی ہنسلی کی ہڈی پر ماری۔ زمان خان نے خاموشی سے چوٹ کو سہا۔ بس چند شکنیں پیشانی پر نمودار ہوئیں اور آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔ پھر اس نے ایسی شدت سے اسے بازوؤں کے شکنجے میں بھینچا کہ بس لمحہ بھر میں اس کی آنکھوں میں تاریکی چھا گئی۔ چپلی کباب اور روٹی کا گھلا ملا مواد کھنچ کر اوپر حلق تک آ گیا اور منہ تیز مرچیلے ذائقے سے بھر گیا۔ سب کچھ منظر سے مطلقاً غائب ہو جانے سے بس ثانیہ بھر پہلے اسے بھکاری کی جلتی ہوئی لکڑی اپنے سر کے اوپر فضا میں بلند ہوتی دکھائی دی۔

اسے ٹھیک ٹھیک یاد تھا کہ آنکھوں سے تاریکی کا پردہ چھٹنے سے قبل اسے ہونٹوں پر ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کا نمکین ذائقہ اور منہ میں بھری چپلی کبابوں کی مرچیلی بساند محسوس ہوئی تھی۔ جیسا بکبکا ذائقہ قے ہو جانے کے بعد منہ میں رہ جاتا ہے۔ اس نے ناگواری کے ساتھ تھوک حلق سے اندر نگلا۔ اسے معدے میں اتھل پتھل کا احساس اور متلی کا زور محسوس ہوا۔ دوسرا احساس پسلیوں کے گرد بازوؤں کی آہنی گرفت کے خاتمے کا تھا جو بتدریج رونما ہوا۔ آہستہ آہستہ گرفت ڈھیلی پڑتی گئی حتیٰ کہ وہ یکسر آزاد ہو گیا۔ اسے زمان خان کا چہرہ دکھائی دیا جو دھیرے دھیرے پرے ہٹ رہا تھا اور پھر ایک طرف سرکتا ہوا منظر سے غائب ہو گیا۔ پھر اسے اپنا آپ محسوس ہوا۔ بازو، سر، پیٹ، ٹانگیں، ناک، ہونٹ اور پیر جن پر وہ کھڑا تھا۔ موت کا خونخوار پرندہ اپنے نوکیلے پنجے پھیلائے اس پر جھپٹا ضرور تھا، مگر اس کے بہت قریب ہو کر، حتیٰ کہ اسے اس کا لمس بھی محسوس ہوا تھا، وہ واپس لوٹ گیا تھا۔

ایک طرف دیوار کے ساتھ زمان خان اور مجنون بھکاری کھڑے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کچھ بات کر رہے تھے۔ وقفے وقفے سے زمان خان سر کو پیچھے جھٹک کر قہقہہ لگاتا اور ہاتھ اس کے ہاتھ پر مارتا۔ وہ دونوں رازداری سے ایک دوسرے کو کچھ بتاتے اور سہج سہج چلتے

ایک طرف نکل گئے جدھر فاصلے پر دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سے کیبن بنے تھے۔ ان کیبنوں میں سے بیشتر کے دروازے تو بھڑے ہوئے تھے۔ چند ایک کے کھلے تھے جن میں سے تیز روشنیاں باہر چھلک رہی تھیں اور اندر کا منظر کچھ کچھ دکھائی دیتا تھا۔ یہ کیبن ایک جیسے حجم کے اور اندر سے بھی قریب ایک ہی جیسے سازوسامان سے بھرے معلوم ہوتے تھے۔ گویا ایک زنجیر تھی جس کی یہ سب کڑیاں تھے۔

کھلے دروازے والے کیبنوں کے اندر دیواروں پر لگے آئینے دکھائی دیتے تھے جن کے گرداگرد چوکھٹے میں روشن بلب آراستہ تھے۔ آئینوں کے نیچے طاقچے تھے جن پر میک اپ کا دھرا سامان تھا۔ ایک طرف بیسن، سامنے گراری کے ذریعے اونچی نیچی ہونے والی کرسی، جس کی پشت پر سر کو پیچھے ٹکانے کے لئے علیحدہ سے چمڑے کے غلاف والی گدی لمبی سلاخ سے بندھی ہوئی تھی۔ زمان خان اور بھکاری دونوں خراماں خراماں چلتے ہوئے، جبکہ اس کی نگاہ مسلسل ان پر جمی ہوئی تھی، ایک بند دروازے والے کیبن کے قریب پہنچے۔ زمان خان نے دروازہ کھولا۔ فوراً ہی تیز روشنیوں میں لپٹا ہوا انسانی آوازوں کا شور کیبن سے باہر چھلک پڑا۔ اندر بہت سے مردوزن جمع تھے۔ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو دروازہ پھر سے بھیڑ دیا گیا۔ اسے اپنے قریب ہی فٹ پاتھ پر وہی لکڑی کا ٹکڑا پڑا دکھائی دیا جسے لیے ہوئے بھکاری کچھ دیر پہلے اس پر جھپٹا تھا۔ اس کا جلتا ہوا سیاہ سرا پانی سے بجھا دیا گیا تھا اور اس میں سے دھویں کی مہین لکیر بل کھاتی ہوئی بلند ہو رہی اور تھوڑا اوپر جا کر شاخ در شاخ تقسیم ہوتے ہوئے فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔

تب پہلی بار اسے اپنے اردگرد کے منظر میں نمایاں تبدیلی کا ادراک ہوا۔ ایک طور سے یہ وہی منظر تھا جسے وہ روزانہ دفتر آتے اور گھر جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ تبھی اسے اپنے ساتھ ہونے والے واقعات یاد آئے اور حیرت آ کر اس سے چمٹ گئی جیسے کوئی خوف زدہ بچہ آ کر اپنی ماں سے لپٹ جائے۔ بھکاری اسے کیوں مارنا چاہتا تھا۔ زمان خان اسے کیوں بھینچ رہا تھا۔ وہ دونوں اسے قتل کرنا چاہتے تھے کیا؟ لیکن کیوں؟ اور کیوں وہ اپنے ارادوں سے تائب ہو کر ایک طرف چل پڑے تھے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو؟ کس بات پر وہ اتنے خوش کیوں تھے اور کیونکر انہوں نے اسے یوں نظرانداز کر دیا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو یا ان کا اس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو؟

اور پھر یہ جگہ؟ کیا یہ وہی کار پارکنگ کا میدان ہے جس کے ایک طرف درختوں سے ڈھکی ہوئی دورویہ سڑک تھی اور دوسری طرف دفتروں سے اٹی ہوئی بلند عمارتیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اوپر چھت پر بڑی بڑی آہنی کڑیوں میں چھوٹے بڑے قمقمے لگے تھے۔ چند ایک روشن تھے، باقی بجھے ہوئے۔ ان قمقموں کے بیچ رنگ برنگی تاروں کا جال بچھا ہوا تھا جس کے عقب میں سیاہ چھت تھی اور کناروں پر نیچے زمین تک آتی دیواریں، جو مل کر ایک بڑے ہال کو تشکیل دے رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر لوگ کھڑے تھے۔ پاس ہی اونچے سٹینڈ پر کیمرا دھرا تھا لیکن اسے چلانے والا ندارد تھا۔ ایک ایسا ہی کیمرا اس کے بائیں ہاتھ پر بھی موجود تھا جس کی دم سے لگی سیاہ موٹی تار زمین پر بل کھاتی ہوئی پرے کرسیوں کے نیچے کہیں گم ہو رہی تھی۔

تب اسے اپنا دفتر دکھائی دیا۔ اس کی عقبی دیوار پر اسی ہشت منزلہ عمارت کی عظیم الجثہ تصویر آویزاں تھی جس میں اس کا دفتر موجود تھا۔ فاصلے سے یہ عمارت دیوار ہی کا حصہ، بلکہ دیوار پر ہی بنائی گئی تصویر معلوم ہوئی۔ لیکن قریب جانے پر یہ عقدہ کھلا کہ یہ ایک بڑا چوبی تختہ تھا جسے دیوار سے جوڑ دیا گیا تھا۔ تختے پر ابھرے ہوئے روغنی رنگوں سے تصویر بنائی گئی تھی۔ تمام جزئیات کے ساتھ یہ ایسی مکمل تصویر تھی کہ معمولی ترین تفصیلات بھی نظر انداز نہیں کی گئی تھیں۔ مثلاً یہی کہ چند روز پہلے ان کے ڈارک روم کی کھڑکی کے ایک پٹ کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا جس کی جگہ سیاہ گتہ منڈھا گیا تھا۔ تصویر میں یہ گتہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

پانچویں منزل میں اسے اپنے کمرے کی کھڑکی کے نیچے دیوار پر آویزاں ''امیجز ایڈورٹائزنگ'' کا بڑا بورڈ دکھائی دیا۔ عمارت ایسے بورڈوں سے اٹی پڑی تھی۔ طرح طرح کے دفاتر یہاں بند کمروں میں موجود تھے جہاں لوگ صبح سے شام تک بہت خاموشی اور قاعدے سے کام کرتے۔ قالین سے ڈھکے فرش والی راہداری میں چلیں تو دن کے وقت بھی فضا میں سناٹا بھرا ہوا معلوم ہوتا۔ دائیں بائیں دروازے ہیں جن پر چھوٹے چھوٹے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ کوئی فارورڈنگ ایجنسی کا دفتر ہے، کوئی کمپیوٹر کمپنی ہے، کوئی امپورٹر ایکسپورٹر ہیں۔ کہیں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بیٹھتے ہیں، تو کسی میں ایڈووکیٹ۔ باہر بھاڑ سا سناٹا، مگر جونہی دروازہ کھولیں، اندر ایک الگ ہی دنیا آباد دکھائی دیتی۔ باہر سے دیکھنے پر کہاں یہ بات کسی کے ذہن میں آسکتی ہے کہ یہ بند دروازوں والے بظاہر بے آباد دفتر اتنے بہت سے لوگوں، ساز و سامان، روشنیوں اور گہما گہمیوں کو اپنے اندر

چھپائے ہوئے ہیں۔ ایسا ہی ایک دفتر اس کا بھی تھا جہاں وہ پچھلے پانچ برس سے کاپی رائٹر کے طور پر ملازم تھا۔

زبان پر ٹھہر جانے والی کڑواہٹ کی طرح زمان خان کا خیال اس کے ذہن کی سطح پر موجود تھا۔ اس نے پیروں تلے فٹ پاتھ کو دیکھا جسے لکڑی کے تختوں کی مدد سے عارضی طور پر بنایا گیا تھا۔ یہ زیادہ بڑا بھی نہیں تھا۔ یہی کوئی دس بارہ گز لمبا اور کوئی ایک ڈیڑھ گز چوڑا ہوگا۔ اس پر چلنے سے لکڑی کے تختوں میں چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوتی۔ اس نے پیر کی ایڑی کو فرش پر مارا، نیچے کھوکھلے پن کی گونج ابھری تو وہ یکبارگی اچھل کر فٹ پاتھ سے نیچے اتر آیا۔

اسے دور کھڑے لوگ دکھائی دیے جو یوں معلوم ہوتا تھا، اسے ہی تک رہے ہوں۔ اس کی اس حرکت پر وہ سب چونکے اور اسکی طرف متوجہ ہوئے۔ ان بہت سے لوگوں میں، جو اس کے لئے اجنبی تھے، ایک چہرہ ایسا بھی تھا جس نے اس کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ یہ نسوانی چہرہ دوسروں کے عقب میں کھڑا ایسی اپنائیت بھری مسکراہٹ میں لپٹا ہوا تھا جو انتہائی پرکشش تھی۔ دوسرے مردوں اور خود عورت کو دیکھنے سے بہت پہلے اسے یہ مسکراہٹ دکھائی دی تھی جسے دیکھنے کے لئے حتیٰ کہ اسے عورت کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی اور جس کا لمس اور مہک اسے ہر طرف پھیلی ہوئی اور روشنی کی طرح اس مختصر سے منظر کا احاطہ کیے معلوم ہوئی۔

''ویل ڈن مسٹر راشد! یو ہیو ڈن اے فنٹاسٹک جاب۔ یوئر این اور اچیومنٹ!'' ایک ٹھگنے قد کے چالیس بیالیس سال کے آدمی نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ اس نے موٹے شیشوں اور پلاسٹک کے چوڑے فریم والی عینک پہن رکھی تھی۔ ناک نمایاں حد تک موٹی اور اس کے باریک نقوش والے چہرے سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ داہنے رخسار پر چنے کی دال کے دانے جتنا ایک سیاہی مائل بھورا نشان تھا جو پیدائشی معلوم ہوتا تھا۔ وہ بھاری بھرکم آواز میں اس سے مخاطب تھا جس میں تحکم کی گونج تھی۔ ڈھیلی قمیص اور پتلون پہنے جس سے وہ فربہ معلوم ہوتا تھا، وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا جیسے فوجیوں کا قاعدہ ہے اور کندھے اچکا کر اور پنجوں کے بل قدرے اچھل اچھل کر بات کرتا۔

''ابھی اکٹھے چائے پیتے ہیں۔ جانا نہیں۔'' وہ اس کے کندھوں سے پرے کسی شے کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر بلند آواز میں پکارا۔ ''فیاض۔ ویٹ فار می۔'' وہ ہاتھ کے اشارے سے دور

کھڑے کسی شخص سے مخاطب تھا۔ پھر اپنی عینک کے شیشوں کے عقب سے شرارتی اور مسکراتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چند ثانیے یونہی خاموشی رہا۔ اس بیچ میں منور اور معطر مسکراہٹ والی عورت دوسرے لوگوں کے درمیان میں سے گزر کر ان دونوں کے قریب آ گئی۔

وہ عورت کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''ایڈیٹنگ روم سے ہو کر آتا ہوں۔ تم جانا مت! آج آخری شاٹ تھا۔ ٹریٹ میری طرف سے ہو گی۔ او کے؟'' عورت کچھ بولی نہیں۔ خاموشی سے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔ ٹھگنا آدمی چھوٹے چھوٹے تیز قدم اٹھاتا ایک طرف چلا گیا جدھر اس نے کسی کو فیاض کہہ کر پکارا اور انتظار کرنے کو کہا تھا۔

''کم آن راشد!'' وہ اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے چلی۔ ایک شخص جو زرد رُو اور نحیف و نزار جثے کا مالک تھا۔ گندمی رنگت اور ہلکے ہلکے بھورے بال، کلین شیو، سادہ اور سستے کپڑے کی سبز شلوار قمیص میں ملبوس یوں جھکا ہوا چل رہا تھا جیسے اسے ڈر تھا کہ اگر وہ اپنے پیروں کو نہ دیکھے گا تو اپنا توازن کھو بیٹھے گا اور گر پڑے گا۔ وہ ان دونوں سے کچھ فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا۔ چلتے ہوئے یوں عاجزی سے مسکراتا گویا کسی سے ہم کلام ہو یا کسی کی بات کا خوش دلی سے جواب دے رہا ہو۔ کسی لیس دار شے کی طرح وہ مسکراہٹ اس کے چہرے سے دھاگے دار قطروں کی صورت میں ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔

عورت اسے بازو سے تھامے ہوئے ہال کے ایک گوشے میں لے آئی جہاں چند کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ پاس ہی ایک کاؤنٹر پر عارضی سی کنٹین بنائی گئی تھی۔ ایک طرف اسٹوو پر بھاپ اگلتی کیتلی میں چائے تیار ہو رہی تھی۔ میز پر شیشے کے مرتبانوں میں بسکٹ، پیسٹریاں اور کریم رول وغیرہ پڑے دکھائی دیتے تھے۔ ان کرسیوں اور میزوں کے درمیان ایک تیرہ چودہ برس کا چھوکرا پھدکتا پھر رہا تھا۔

جونہی وہ کرسیوں کے نزدیک پہنچے، وہ منحنی سا شخص آگے بڑھا۔ ''السلام علیکم!'' وہ ان کے سامنے اس حد تک جھک گیا کہ انہیں اس کے کولھے دکھائی دیے۔ ''نورین جی اور راشد صاحب اللہ آپ پر نظر سوتی رکھے۔ ماشاء اللہ جی بڑا پیارا کام کرتے ہیں آپ۔ آپ انڈسٹری کی شان ہیں۔'' وہ اپنی پیلی بتیسی دکھاتے ہوئے ہنس رہا تھا۔

''شاہ جی! آپ کیسے ہیں!'' نورین اپنے بالوں کو ماتھے پر سنوارتے ہوئے بولی۔ اس کا

بازو بدستور نورین کے ہاتھ میں تھا۔عورت کے جسم سے کسی اچھے پرفیوم کی بھینی مہک اٹھ رہی تھی۔

''بس جی، نورین بی بی! اللہ کا بڑا کرم ہے۔ بڑا فضل ہے جی۔ اس عاجز پر بڑی نظر سوتی ہے سوہنے رب کی۔'' اس نے گہری سانس بھری اور اداس لہجے میں کہا۔

''آپ کی 'بدقسمت' کیسی چل رہی ہے شاہ جی؟ سنا ہے بڑا رش لے رہی ہے۔'' وہ بولی۔

''اللہ کا کرم ہے جی۔ میرا رول تو تھوڑا سا ہی ہے۔ آپ کو تو پتا ہے۔ یہ جو روزی روٹی ہے نہ جی، یہ تو سب اس کے چکر ہیں۔ جس کے نصیب میں جتنا روٹی ٹکر ہے وہ اسے ملے گا۔ پتھر کے کیڑے کو بھی ملتا ہے نہ جی اس کا حصہ۔ میرا بھی گزارا ہو رہا ہے۔ فلم تو اے ون ہے جی۔ رول بھاویں چھوٹا ہو، پر ساری بات کاسٹ کی ہوتی ہے۔ کاسٹ بڑی ٹائٹ ہے۔ بخشی صاحب ہیں، موسیقی جی اے رانا کی، سٹوری اشفاق صاحب کی ہے۔ ان کی 'اٹ کھڑکا' تو معلوم ہے آپ کو کتنا بزنس کیا تھا اس نے۔ ایسے ایسے ڈائیلاگ لکھے ہیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ بس جی مولا کرم کرے تو پبلک اس فلم کو بھولے گی نہیں۔ بڑی امید ہے جی۔ مولا پروردگار چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔''

''پبلک آپ کو پسند کرتی ہے، شاہ جی! میں تو کہتی ہوں کہ کریکٹر ایکٹنگ آپ سے بہتر کون کرتا ہے۔''

''نہ جی نہ۔ اب شرمندہ نہ کریں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ جوڑیاں سلامت رہیں۔ آپ قسمت کے دھنی ہیں۔ آپ تو جی گنی لوگ ہیں۔ بڑے بڑے یہاں آئے۔ یہ فلم انڈسٹری تو ایک کھونہہ ہے۔ کوئی تھاہ ہی نہیں ہے اس کی۔ کیسے کیسے لوگ آئے (ٹھنڈی آہ بھرتا ہے) بڑا بڑا نام پیدا کیا اپنے زمانے میں۔ ان کی فلمیں ایسے سپرہٹ ہوتی تھیں کہ سالوں چلتی تھیں۔ مگر جی رہے نام اللہ کا۔ باقی کون رہا؟ یہ گنتی کے کچھ نام زندہ ہیں۔ بس انہی لوگوں کے جی، جو گنی تھے۔ ماشاء اللہ آپ تو انڈسٹری کی رونق ہیں۔ راشد صاحب کو دنیا نے مانا ہے۔ بڑے بڑے ان کے آگے پانی مانگتے ہیں۔ بس جی اللہ کی دین ہے۔ اس کی نظر جس پر ہو جائے۔ آپ کتنا ہی حسن لے آیئے۔ کیسی ہی تگڑی سفارشیں ہوں جی، گن اسی کے پاس ہے جسے اللہ توفیق دے۔ اوہ ہو۔'' شاہ صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے سر جھکا لیا۔ دیر تک استغراق کی کیفیت میں رہے۔ پھر سر اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔ وہی مسکین سی عاجزانہ مسکراہٹ بدستور اس کے چہرے سے چپکی ہوئی تھی۔

پان کی سرخی میں بھیگے ہوئے سیاہ ہونٹوں کے بیچ زرد بتیسی دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے جسم کی نزاری کی نسبت سر چوڑا معلوم ہوتا تھا جس کے وسط میں چمکتی ہوئی چندیا تھی۔ باقی ٹانوان ٹانوان کھڑے بال تھے۔ اس نے حسب سابق غیر معمولی حد تک جھکتے ہوئے دونوں ہاتھ بڑھا کر ان سے مصافحہ کیا اور پھر ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہاتھوں کو چھاتی پر دل کے مقام پر رکھے دیر تک دباتا رہا۔

''آپ اگر برا نہ سمجھیں اور تھوڑا وقت آپ کے پاس ہو تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی اگر آپ مجھ سے چائے پی لیں۔ ایک پیالی چائے۔ یہ موقع کب ملتا ہے۔ راشد صاحب جیسے گنی لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا۔''

''نہیں شاہ صاحب۔ بڑی عنایت آپ کی۔ آپ کی چائے ادھار رہی۔ آج آخری شاٹ تھا 'دائرہ' کا۔ آپ تو جانتے ہیں۔ کتنی محنت کی ہے راشد نے اس فلم کے لیے۔ اب تھوڑا ہمیں ریلیکس ہونے کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ پھر کسی دن ضرور آپ سے چائے پئیں گے۔''

''اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ اللہ۔۔۔۔'' وہ زیر لب ہولے ہولے گنگناتا رہا۔ نورین نے اس کا بازو کھینچا اور ساتھ لیے پرے نکڑ میں چلی گئی جہاں آمنے سامنے دو دو کرسیاں قاعدے سے پڑی ہوئی تھیں۔ پہلے اسے بٹھایا پھر سامنے کرسی پر خود بیٹھ گئی۔

''تم کیا کہتے ہو۔ میرے پرفارمنس کیسی تھی آج؟'' وہ بیٹھتے ہی بولی اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے چھوٹے سے بستہ نما تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کھنگالنے لگی۔ تھیلے میں سے ننھا سا گول آئینہ اور ہیئر برش باہر نکالا۔ آئینے کو چہرے کے سامنے کیا اور احتیاط سے بالوں کو سنوارا جو اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔ وہ اپنے آپ میں اتنی منہمک تھی کہ پہلی بار اسے اپنی الجھی ہوئی سوچوں کے غبار میں سے سر باہر نکال کر عورت کو بغور دیکھنے کی خواہش ہوئی۔

وہ یہی کوئی چوبیس پچیس کے پیٹے میں ہوگی۔ 'لڑکی ہی تو ہے۔' وہ خود سے بولا۔ کھلی ہوئی رنگت، باریک نقوش، باریک ٹھوڑی کے اوپر موٹے قلم سے کھنچی دو لکیروں جیسے باریک سرخ ہونٹ، جبڑے کی ابھرواں اور نرم ہڈی، چکنی جلد، لمبا مگر بھرا ہوا چہرہ، ہلکی ہلکی سی بھیگی ہوئی، پرنم معلوم ہوتی اور چمکتی ہوئی آنکھیں، یوں کہ معلوم ہو جیسے ابھی چھلک پڑیں گی، نچی ہوئی اور باریک لہردار خط کی مانند دکھائی دیتی بھنویں۔ اس نے سرخی مائل بھورے رنگ کی لپ سٹک ہونٹوں پر لگا

رکھی اور کچھ ایسا ہی رنگ بھنوروں پر چھڑکا ہوا تھا۔ کچھ دیر وہ ہونٹوں کو دبا کر اور چہرے کو مختلف زاویوں سے موڑ کر آئینے میں میک اپ کی جانچ کرتی رہی۔ پھر دونوں چیزیں واپس تھیلے میں ڈال دیں۔

''تم نے کچھ کہا نہیں۔'' وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی اور بے تکلفی سے دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ اسے اپنے جسم میں ارتعاش کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی اور کنپٹیوں میں حدت سی بھرنے لگی۔ وہ کسمسایا۔ عورت نے اپنے ہاتھ نہ اٹھائے اور محبت سے اس کے چہرے کو تکتی رہی۔

''تم تھکے ہوئے ہو!'' وہ قربت کی خواہش سے بھری آواز میں بولی۔ ''راشد! میری طرف دیکھو!'' فوری طور پر گویا حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس نے لحہ بھر کے لئے عورت کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر گھبرا کر منہ پرے پھیر لیا۔ وہ مسکرا دی۔

''میرا خود کوئی موڈ نہیں ہے یہاں بیٹھنے کا۔ میں تبھی کمال صاحب کو منع کرنے کا سوچ رہی تھی۔ پر انہوں نے بڑی چاہ سے کہا تھا۔ آتے ہی ہوں گے۔ پھر چلیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے عورت نے اپنے ہاتھ واپس کھینچ لیے اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''جب بھی کوئی لڑکی دیکھوں، میرا دل دیوانہ بولے، اونہوں اونہوں اونہوں۔ جب بھی کوئی لڑکی۔'' تیرہ چودہ برس کا چھوکرا اونچی آواز میں گنگناتا، میلی صافی ہاتھ میں لیے ان کے قریب آیا۔ ''سلام مس جی! سلام صاحب!'' اور ہاتھ کو سر کے اوپر رکھے مداری کے بچے جمورے کی طرح ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''گرما گرم چائے صاحب!''

''دو لے آؤ!'' نورین اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ وہ اپنی انگلیوں کے ناخن آنکھوں کے سامنے نچا نچا کر ان پر چڑھی لہو سی سرخ پالش کی جانچ کر رہی تھی۔ آرڈر لینے کے باوجود چھوکرا کھڑا ہنستا ہوا انہیں تکتا رہا۔ ''تو جاتا نہیں؟'' وہ قدرے درشتی سے بولی۔ چھوکرے نے ویسے ہی مداری کے بچے جمورے کی طرح داہنا ہاتھ اٹھا کر سر پر ڈالا اور ہنسنے لگا۔ پھر صافہ کندھے پر رکھا اور 'جب بھی کوئی لڑکی دیکھوں میرا دل دیوانہ بولے، اونہوں، اونہوں، اونہوں۔'' گاتا ہوا کنٹین کی طرف چلا گیا۔

''استاد دو چائے۔ اونہوں، اونہوں، اونہوں۔'' وہ اسی گانے کی لے میں پکارا اور دوسری کرسیوں کی طرف بڑھ گیا جہاں کچھ اور لوگ آن بیٹھے تھے۔

''میرا خیال ہے کمال صاحب کو منع کر ہی آتی ہوں۔'' وہ کچھ آگے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ وہ اس سے نظر ملانے سے کترا رہا تھا۔ پل بھر کے لئے ہی نگاہ ملاتا لیکن وہاں اتنی اپنائیت اور محبت کی نمی تھی کہ اس سے سہاری نہ جاتی۔ اتنی خوبصورت عورت کے اتنے قریب ہونا کہ وہ آپ کو سپردگی کی نگاہ سے دیکھے، اس کے بہت تھوڑے سے حوصلے کے مقابلے میں بہت بڑی بات تھی، جس کا وہ متحمل نہیں تھا۔

''گھر چلتے ہیں۔ میں بھی تھک گئی ہوں۔'' وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہولے ہولے مسکراتے ہوئے بولی۔ وہ جھینپ گیا۔ چہرہ یوں سرخ ہو گیا کہ خون جیسے اس کے چہرے کی جلد سے باہر رس پڑے گا۔ ''اچھا میں یوں کرتی ہوں۔ ایڈیٹنگ روم میں ہی انہیں دیکھتی ہوں۔ بے چارے بعد میں ہمیں ڈھونڈتے پھریں گے۔ بس یوں گئی اور یوں آئی۔'' وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولی جو بے آواز تھی اور پھر اپنے تھیلے کو، جو رنگ برنگی دھاریوں سے بنا ہوا تھا، کرسی پر ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک طرف تیز تیز چل دی۔

جبھی چھوکرا چائے لے آیا۔ وہ خالی کرسی پر پڑے رنگدار سوتی ڈوریوں والے تھیلے کو تکتے ہوئے بولا، ''مس جی گئیں؟'' پھر اس کا جواب سنے بغیر وہ بتیسی نکال کر ہنس دیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چھوکرا یونہی ہنستے ہوئے کھڑا رہا۔

''صاحب چائے!'' چھوکرے نے خالی کرسی پر، جہاں پہلے نورین بیٹھی تھی، ٹرے رکھ دیا۔ یہ تام چینی کا ٹرے تھا جس میں دو چھوٹی پلیٹوں میں دو کپ پڑے تھے۔ کپوں میں سے بھاپ کی باریک بدلیاں اٹھ رہی تھیں۔ چھوکرے نے ایک تیسری کرسی ان دو کرسیوں کے قریب کی اور پھر ٹرے اٹھا کر اس پر رکھ دی۔ ''صاحب جی! سلام علیکم!'' وہ اپنے سر پر ہاتھ الٹا لٹا کر مداری کے جمورے کی طرح کھڑا ہو گیا اور بتیسی نکال کر ہولے تھرکنے لگا۔ ''صاحب جی! تم نے وعدہ کیا تھا ایک چانس کا۔'' وہ سرکتا ہوا اس کے قریب ہو گیا اور آواز کو قدرے دھیما کرتے ہوئے بولا ''بس ایک چانس، صاحب جی! استاد بتاتا ہے یہ انور پاشا دس سال پہلے استاد کے ساتھ ہی ادھر آیا تھا۔ آج وہ کدھر ہے اور اپنا استاد کدھر۔ استاد آج بھی کنٹین چلاتا ہے اور وہ بڑا آرٹسٹ بن گیا۔ بڑی

گاڑی میں گھومتا ہے۔ بغل میں چھوکری۔ صاب جی بس ایک چانس کی بات ہے۔ استاد کو چانس نہیں ملا، ورنہ اپنا استاد بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے مجھ میں ہیرو بننے کا سپارک ہے۔ بس ایک چانس ملنے کی دیر ہے۔ صاب جی! تم نے اس دن مجھ سے کہا تھا کہ مجھے فلم میں چانس دلاؤ گے۔ اپنا وعدہ یاد ہے نا؟ کوئی چھوٹا سارول بھی چلے گا۔ بس ایک بار انٹری ہو جائے، باقی میں سنبھال لوں گا۔ تمہارے لئے تو یہ چٹکی بجانے کا کام ہے صاب! کسی بھی پروڈیوسر سے میری سفارش کر دو۔ کوئی تم کو انکار کر سکتا ہے بھلا! حرامی نے اپنے کو مارکیٹ سے آؤٹ کرانا ہے۔ کوئی بھی چھوٹا سارول، ولن کی سائیڈ کا ہو یا ہیرو کی سائیڈ کا ٹھیک ہے نا صاب؟۔۔۔پر۔۔۔'' وہ کچھ اور اس کے قریب ہو گیا اور آواز مزید دھیمی کر کے بولا'' استاد کو نہ پتا چلے کہ میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے۔ وہ برا مناتا ہے۔ کہتا ہے کسٹمر کو خراب نہ کیا کرو۔ تم ہی بتاؤ کیا تم کسٹمر ہو؟ یہ سارا اسٹوڈیو چلتا ہی آپ لوگوں کی وجہ سے ہے۔ آپ تو یہیں کے آدمی ہو۔ کسٹمر تو وہ ہوا جو باہر سے آتا ہے۔ جیسے خود استاد باہر سے آتا ہے، یا میں آتا ہوں، یا وہ بوٹ پالش والا پٹھان چھوکرا آتا ہے۔ ہی ہی ہی۔'' وہ پھر سے اونچی آواز میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

اس نے نظر بھر کر چھوکرے کو دیکھا۔ وہ نیلی قمیض پہنے ہوئے تھا جس کا کالر میل سے سیاہ ہو رہا تھا۔ اس نے کف لپیٹ کر اوپر چڑھائے ہوئے تھے۔ نیچے سیاہی مائل گہرے جامنی رنگ کی پتلون تھی۔ آنکھوں کے کناروں پر آلائش جمی ہوئی تھی۔ گردن پر میل کی چھائیاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ گالوں پر بالوں کی ابتدائی نرم روئی جیسی فصل پھوٹ آئی تھی۔ ہاتھ کی انگلیاں، جن میں اس نے صافی پکڑی ہوئی تھی، کے ناخنوں میں سیاہ میل بھری تھی۔ تمام جسم میں واحد شے، جو صاف ستھری نہ سہی مگر قرینے اور سلیقے سے سنوری اور الجھاؤ کے بغیر دکھائی دیتی تھی، وہ اس کے بال تھے جنہیں بہت احتیاط سے کنگھی کیا اور خاص فیشنی انداز میں ترشوایا گیا تھا۔

اس نے سوچا' کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ یہ قلاش چھوکرا کل کو فلم انڈسٹری کا کوئی بڑا ہیرو یا ولن بن جائے؟ تاریخ سے زیادہ بڑا معمہ اور کیا ہوگا؟ کوئی ایک چانس نہ معلوم اسے کب مل جائے اور اسے اس کی توقع سے بھی زیادہ شہرت اور نام دلا دے۔ جیسے انور پاشا کی کایا پلٹی، جس کا اس نے ابھی ذکر کیا۔ لیکن انور پاشا تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ تاریخ کے لیے نام کے کیا معنی۔ وہ اس معجزے کو کسی کے ساتھ بھی دہرا سکتی ہے۔

''صاب ایک چائے لے جاؤں؟ مس صاب آئیں گی تو دوبارہ لے آؤں گا۔'' چھوکرا بولا۔وہ اٹھ کھڑا ہوا۔''صاب جی!''

''میں راشد نہیں ہوں۔'' وہ اٹھ کر فاصلے پر موجود ایک بڑے پھاٹک نما دروازے کو دیکھتے ہوئے بولا۔وہ چھوکرے کے وجود سے یوں بے خبر معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بات اس نے کسی اور سے کہی ہو۔چھوکرے نے فقط ہنستے ہوئے اسے دیکھا اور پھر سے مداری کے جمورے کی طرح ہاتھ کو الٹا کر کے سر پر رکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس جملے کی رمز کا اسے کیا پتہ۔اور'' آجا، آجا میری جان جاں، آجا آجا میری دلربا۔۔۔'' گاتا ہوا مڑ کر چل دیا۔

اس نے چھوکرے کو جاتے ہوئے دیکھا۔زمان خان اور بھکاری والے واقعے کے بعد اس نے پہلی بار خود کو اکیلا محسوس کیا۔پھر اس طرف نگاہ کی جدھر کچھ دیر پہلے نورین گئی تھی۔فاصلے پر دیوار کے ساتھ اس کے دفتر والی ہشت منزلہ عمارت کی جہازی حجم کی تصویر بدستور لگی کھڑی تھی جس کے نیچے نقلی چوبی فٹ پاتھ موجود تھا۔ایک طرف سیاہ سر والی بجھی ہوئی لکڑی فرش پر دھری تھی جس میں دھوئیں کی لاٹ اٹھنا موقوف ہو چکی تھی۔دو اشخاص پہیوں اور لمبی ٹانگوں والے ایک بڑے کیمرا اسٹینڈ کو دھکیلتے ہوئے ایک طرف لے جا رہے تھے۔چھوٹے چھوٹے روشن کیبنوں کے دروازے پہلے کی طرح بھڑے ہوئے تھے اور ان دروازوں کی درزوں میں سے جھانکتے ہوئے تیز روشنی کے قتلے باہر فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ایک لمبی سی چوبی سیڑھی کو چھت کے شہتیر سے ٹکائے ایک شخص اوپر ٹنگی بڑی فلش لائٹ کو اتار یا ٹانگ رہا تھا۔ہر طرف گہما گہمی کا سماں تھا۔'یہ سب کیا تھا؟' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر خود ہی اس منظر سے اوب گیا۔وہ پہلے کبھی یہاں نہیں آیا تھا۔یہ ماحول اس کے لیے اجنبی تھا اور اسے یہاں الجھن ہو رہی تھی۔ایک بار پھر سے اس نے اپنے اردگرد دیکھا اور پھر پھاٹک کی طرف ہو لیا جو کھلا تھا اور جس سے باہر اوپر گہرا تاریک آسمان دکھائی دیتا تھا۔